"اُردو ناول اور عصریت"(از کامران کاظمی) کا تجزیاتی مطالعہ

طاہرہ صدیقہ

محمد نوید

Abstract:

In this paper, a critical review of a very important work regarding Urdu novel and contemporary awareness has been presented. This work can be considered as a rich research effort in the search for contemporary awareness in Urdu novels. This paper not only provides a thorough critical review of this work but also sheds light on the various questions raised in it andtheir answers. This book covers the period from the beginning of novel writing to the 21st century. An analytical study of the book has been done in this paper.

ناول کی کوئی جامع تعریف ممکن نہیں۔یہ کہا جاسکتا ہے کہ جس قصے کا بیانیہ نثر میں ہو اور طوالت کا حامل ہو، وہ ناول ہے۔ مگر اس کی طوالت کا کوئی حتمی پیمانہ نہیں۔ناول ڈیڑھ صفحے کا بھی ہو سکتا ہے اور اس کی ضخامت ہزاروں صفحات پر بھی محیط ہو سکتی ہے۔اس میں غضب کا تنوع پایا جاتا ہے اور مضمر امکانات کی کوئی حد نہیں۔ناول کی جس مختصر مگر تسلّی بخش تعریف پر اتفاق کیا جاسکتا ہے، وہ یہ ہے کہ تخیل کو بروئے کار لائے بغیر ناول نہیں تخلیق کیا جاسکتا۔جب ناول ادبی اُفق پر تازہ تازہ نمودار ہوا تو اُس کا تعلق حقیقت پسندی سے جُڑا ہوا تھا اور یہ نئی بات تھی۔قصہ، کہانی، داستان اور مثنوی زمان و مکان کی حدود و قیود سے آزاد تھے اور ان کے کردار اور ماحول بہت حد تک تخیلاتی ہوا کرتے تھے۔اس کے برخلاف ناول نگار اپنے گرد و پیش اور معاصرانہ فضا پر گہری نظر رکھتا تھا۔

اُردو ناول کی تاریخ زیادہ قدیم نہیں۔اس کا آغاز نو آبادیاتی عہد میں ڈپٹی نذیر احمد کی تمثیلی کہانیوں سے ہوا۔اُن کے ناول "مراۃ العروس" سے بیسویں صدی کی دوسری دہائی کے اختتام تک کے اُردو ناولوں کا جائزہ لیا جائے تو ان تمام ناولوں میں جو چیز نمایاں اور مشترک ہے، وہ عصریت ہے۔اُردو ناول نے

آغاز ہی میں اُردو داستان کی جگہ لے لی اور برصغیر پاک و ہند کی معاشرتی، سماجی و سیاسی زندگی کو اپنے اندر یوں سمو لیا کہ اصنافِ شعر و نثر میں اس ضمن میں کوئی اور صنف ناول کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

نو آبادیاتی استبدادی نظام کے قیام کے حالات، برصغیر میں طبقاتی تقسیم، مختلف ادوار میں تہذیبوں کا زوال، تقسیم ہندوستان، ہجرت و فسادات، آباد کاری کے مسائل نو زائیدہ مملکت میں سیاسی ابتری، سانحہ بنگلہ دیش، نائن الیون کے بعد کا منظر نامہ، اکیسویں صدی میں عالمگیریت کے اثرات ان تمام حالات کا عکس اُردو ناول میں ملتا ہے۔اس کے علاوہ رومانویت، ترقی پسندیدیت، جدیدیت، علامتیت، وجودیت اور مابعد جدیدیت جیسی عالمی ادبی تحریکوں کے براہ راست اثرات اُردو ناول میں دکھائی دیتے ہیں۔ناول تمام اصناف اور علم و ادب کی جملہ شاخوں سے بڑھ کر اہم صنف ہے۔اُردو کے ناول نگاروں نے اپنے عہد کے سیاسی، سماجی، معاشرتی اور معاشی تغیرات کا بغور مشاہدہ کیا اور اس کے اثرات قبول کرتے ہوئے اپنے عہد کی ابتری کے اُس وقت اور زمانہ کے علاوہ آئندہ آمدہ عہد پر اثرات کو بھی پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔چونکہ ادیب محض اپنے عہد ہی کا نمائندہ نہیں ہوتا بلکہ وہ ماضی کی روایات، نظریات و تصورات کا امین اور مستقبل کا نقیب بھی ہوتا ہے لہٰذا اُردو ناول نگاروں نے اُردو ناول میں داخلی و خارجی عوامل کو شامل کیا اور اسے انفرادی نظریات اور اپنے زمانی حالات کے اظہار کے ساتھ ساتھ اجتماعیت اور عالمگیریت سے دوچار کیا۔

ڈاکٹر کامران عباس کاظمی کی ۶۴۲ صفحات پر مشتمل تصنیف "اردو ناول اور عصریت" اپنے موضوع کے اعتبار سے بے حد اہمیت کی حامل ہے۔اُنھوں نے اسے اُردو ناولوں میں عصریت کی تلاش کے حوالے سے تحقیقی کاوش قرار دیا ہے اور اس تصنیف کے ذریعے محاکمہ کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردو ناول نگار اردو ناول کے آغاز سے بیسویں صدی کے اواخر تک عصریت کی تلاش میں کس حد تک کامیاب رہے۔کیا اردو ناول میں ذاتی تجربات، تخیل کی کارفرمائی ہے یا پھر سابقہ اور معاصر علوم سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔اس ضمن میں یہ بھی جاننے کی کوشش کی گئی ہے کہ ذاتی تجربات میں اجتماعیت کا پہلو کس درجہ شامل ہے اور تخیل کی کارفرمائی کی صورت میں حقیقت کا عنصر کس قدر ہے نیز سابقہ اور معاصر علوم سے استفادے کی صورت میں بین المتنویت کتنی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ ناول کا متنی اور تناظراتی مطالعہ عصری ڈسکورس کی تعمیر یا تخریب میں کس حد تک کار آمد ہے، ان تمام مباحث کو مصنف نے عصریت کی ذیل میں دیکھا ہے۔اس کتاب کو پانچ ابواب میں منقسم کیا گیا ہے۔اوّلین باب میں عصری آگہی اور اس کے

تشکیلی عناصر تاریخی شعور، تہذیبی و ثقافتی شعور، سیاسی و سماجی تصور اور روح عصر کے حوالے سے تفصیلی بحث کے بعد ثابت کیا گیا ہے کہ ناول کی صنف عصری آگہی کی یافت کا بنیادی ماخذ ہے۔

نسانی زندگی ایک مکمل اکائی یا وحدت کی حیثیت رکھتی ہے لہٰذا کسی خاص عہد کے افراد اپنے عصری شعور کو ماضی سے منقطع کر کے نہیں سمجھ سکتے۔ گویا ماضی کی روایات، تجربات، مشاہدات اور نظریات و تصورات کا ادراک حاصل کیے بغیر عصری آگہی کی بازیافت ممکن ہی نہیں ہے۔ فرد کا براہ راست اپنے عصر یا اپنے عہد کی ارتقائی منازل کو جاننا اُس کی عصری آگہی کے مترادف ہے۔ اس کی مزید وضاحت یوں کی جاسکتی ہے کہ کسی عہد کی سماجی، سیاسی، عمرانی، نفسیاتی، روحانی، معاشی و معاشرتی صورتحال کو تاریخی تناظر میں جاننا اور مستقبل کے ارتقائی امکانات سے آگاہی عصری آگہی کہلاتی ہے۔

انسان عملی طور پر مدنی الطبع ہے اور گروہی زندگی اُس کا خاصہ ہے لہٰذا معاشرے کا تصور ہی گروہی زندگی سے اُبھرتا ہے۔ ہر گروہ اپنے طبعی حالات، جغرافیائی ماحول اور وراثتی خصائص کے مطابق اپنے گروہ کی اندرونی و بیرونی ساخت کی تشکیل کرتا ہے اور اپنی انفرادی معاشرتی خصوصیات کو فروغ دیتا ہے۔ ڈاکٹر مظفر حسن اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> "یہ تنظیم جسے معاشرہ کا نام دیا جاتا ہے، جو انسانی فعالیتوں کو موقع کے مطابق منظم اور خود اختیار بناتی ہے، معیار مقرر کرتی ہے، پھر ان پر عمل کے لیے مجبور کرتی ہے اور انھیں قائم رکھتی ہے۔ یہ معیار واقدار نامکمل بھی ہو سکتی ہیں اور بعض اوقات وجہ نزاع بھی"۔(۱)

عصریت میں اس کے علاوہ وہ صورتحال بھی موجود ہوتی ہے، جو کسی مخصوص عہد کو درپیش ہو۔ عصریت کسی عہد کے تمام امکانات کے مکمل احاطے کا نام ہے۔ مصنف نے عصریت کے عناصر ترکیبی کو چار بنیادی عنوانات میں تقسیم کیا ہے جن میں تاریخی شعور، تہذیبی و ثقافتی شعور، سیاسی و سماجی شعور اور روح عصر شامل ہیں۔

تاریخی شعور سے مراد ہے کہ کوئی بھی تخلیق کار اپنی تاریخ کی بازگوئی میں اسے اپنے شعور کا حصہ بنائے اور اپنے تخلیقی عمل میں شامل کرنے کے بعد اس کا اظہار کرے۔ تاریخ کی بازگوئی میں محض تاریخ کا بیان یا ذکر نہ ہو بلکہ ادبی سطح پر تاریخ کے ساتھ فن کار اپنی سماجی و تہذیبی زندگی کے تعلق کے امکانات پیدا کرے اور تاریخی عمل میں موجود زندگی کی بہتر طور پر صورت گری کرے۔

مصنف نے نہایت خوبی اور مہارت سے اس امکان کی تشریح و توضیح کی کوشش کی ہے کہ تاریخ کا براہ راست رشتہ انسان کی انفرادی اور بالخصوص اجتماعی زندگی، ثقافتی ورثے اور تہذیبی ارتقا سے ہوتا ہے۔ ادب کی بھی عمومی تعریف یہی ہے کہ یہ زندگی کا عکاس ہوتا ہے اور ادب کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ اس میں اُس عہد کی جھلک دکھائی دی جانی چاہیے، جس عہد میں وہ تخلیق ہوا ہے۔ تاریخ کا تعلق انسانی سماجی ارتقا اور اس کے تغیرات و امکانات سے ہوتا ہے جبکہ ادب کا موضوع بھی سماجی صورتحال بنتی ہے۔ یہ سماجی موضوعات شعری اصناف سے زیادہ نثری اصناف جیسے ناول، ڈرامہ اور افسانہ میں بہتر اظہار پاتے ہیں۔

دیگر ادبی اصناف کی مانند ناول نگار کے لیے بھی تخیل لازم وصف قرار پاتا ہے۔ ارسطو نے تاریخ کو ادب سے کمتر درجہ سمجھا کیونکہ تاریخ معلوم تک محدود رہتی ہے جبکہ ادب نامعلوم کو بھی اپنے دائرے میں لے آتا ہے۔ تاریخ واقعات کو یوں بیان کرتی ہے جیسا کہ حقیقت میں وہ ہیں مگر ادیب اُنھیں اس طرح بیان کرتا ہے جیسا کہ اُنھیں ہونا چاہیے۔ تاریخ میں تخیل کی کارفرمائی اُس کی صداقت کو مجروح کر دے گی جبکہ ادب تخیل کے عمل کی پیداوار ہے۔ تاریخی شعور کا حامل ناول نگار تاریخی صداقت کو عمل تخیل میں مجروح ہونے سے بچالیتا ہے۔ ناول کا دائرہ کار چونکہ زندگی کی وُسعت اور بوقلمونی پر مشتمل ہوتا ہے اس لیے تاریخ بالعموم ناول کا موضوع بنتی ہے۔ عالمی سطح پر ایسے ناول زیادہ مقبول اور کامیاب قرار پائے ہیں جن میں کسی مخصوص تاریخی واقعے یا موضوع کو برتا گیا ہے۔

ناول میں تاریخی شعور کے علاوہ تہذیبی و ثقافتی شعور بھی بنیادی لازمہ ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ فرد بطور سماجی اکائی یا سماجی گروہ اپنے تاریخی عمل میں موجود اپنے ثقافتی و تہذیبی ورثے کی شناخت کرے اور اس کے جامد اور غیر متحرک افعال کو متحرک اور زندہ افعال کے ساتھ تبدیل کرے نیز جدید صورتحال کو تہذیبی و ثقافتی تاریخ سے ہم آہنگ کرے یا ان میں موجود رشتوں کو تلاش کر کے قابل عمل پہلو اختیار کرے تو وہ فرد یا سماجی گروہ تہذیبی و ثقافتی شعور کا حامل ہو گا۔ ادب اور تہذیبی و ثقافتی شعور کا ساتھ گہرا ہے اور ان کے رشتے میں گہری تخلیقی ہم آہنگی موجود ہے۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی ثقافت کو ایک بڑا کل اور ادب کو اُس کا جزو بجا طور پر قرار دیتے ہیں۔ اُن کے بقول:

"ادب اور ثقافت کے رشتے اس قدر گہرے ہیں کہ ان پر جبریت کی تعریف صادق آتی ہے۔ غالباً اگر یہ کہا جائے کہ انسانی زندگی کا "کل" ثقافت ہے اور ادب اس "کل" کا ایک "جز" تو زیادہ غلط نہ ہو گا۔"(۲)

ہر عہد کے ادب میں اُس کے نمایاں تاریخی تہذیبی عناصر واضح جھلکتے دکھائی دیتے ہیں۔ اگر تہذیب اپنے عصری شعور کا ساتھ نہ دے پائے تو انقلابات اُسے قصۂ پارینہ بنا دیں گے اور ایسا ہوا بھی ہے۔ جب بھی سماج میں کوئی بڑی تبدیلی آئی تو تہذیب کا بڑا حصہ اور ادب جو اس کا ساتھ نہیں دے سکے ،وہ ختم ہو گئے۔ انسانی تہذیب و ثقافت ہر عہد کے ادب کو متاثر کرتی ہے اور اس کے انھی حصوں کو پائیدار بناتی ہے جو عملِ خیر کا سرچشمہ ہوتے ہیں اور عملِ خیر کا سرچشمہ بھی سماج کے سیاسی و سماجی شعور سے ہی ترتیب پاتا ہے۔ سیاسی شعور سماجی تاریخی تبدیلیوں اور ان کے محرکات کے فہم سے پیدا ہوتا ہے۔ جدید سیاسی شعور اب محض ریاستی نظم و نسق تک محدود نہیں بلکہ اس کا دائرہ کار جدید علوم اور ان کے پیدا کردہ اثرات تک پھیل چکا ہے۔ تخلیق کار اگر واضح سیاسی شعور کا حامل نہیں ہو گا تو وہ سماج اور سیاست میں موجود رشتے کی فعالیت پر غور نہیں کر سکے گا اور نہ ہی اس کا درست تجزیہ کرنے کی قدرت رکھ سکے گا۔ ڈاکٹر کامران کاظمی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"درست سیاسی شعور کی موجودگی کے بغیر افراد معاشرہ سماج اور زندگی میں موجود ارتقائی رشتے کو دریافت نہیں کر سکتے۔ سیاسی شعور سماج کے عصری تقاضوں اور ماضی یا تاریخ کے تجربات اور ان کے نتائج کے مابین رشتوں کے قرار سے وضع ہوتا ہے۔ فنکار کا سیاسی شعور جس قدر واضح ہو گا اُس کا نظریہ زندگی بھی اُسی قدر واضح ہو گا"۔(۳)

اردو ادب نے تاریخ کے مختلف ادوار میں اپنے سماج کی عکاسی کا فریضہ انجام دیا ہے۔ یہ الگ بات کہ اس کی کمیت اور حیثیت میں اختلاف کی گنجائش موجود ہے۔ شاعری اور داستان کی نسبت ناول جدید دور کی پیداوار صنف ہے۔ اس سوال کے جواب کی تلاش کے لیے کہ کیا اردو ناول اپنے عصری رجحان سے مطابقت قائم کر پایا ہے ، یہ دیکھا جانا چاہیے کہ ناول نگاروں نے ابتدا ہی میں سیاسی محاذ آرائی کے بجائے سماجی اخلاقی اصلاح کا بیڑا اُٹھایا۔ یوں آغاز سے ہی اردو ناول کی جہت اصلاحی متعین ہو گئی تھی۔ اردو ناول اپنے عصری رجحانات سے متاثر ہوتا رہا ہے۔ ناول کا منظر نامہ چونکہ زیادہ وسیع ہوتا ہے اس لیے روح عصر

کی نمود کا امکان ناول میں دیگر اصناف کی نسبت زیادہ ہوتا ہے۔ زندگی کے تمام موضوعات خواہ وہ کسی بھی نوعیت کے ہوں ناول کا حصہ بنائے گئے کیونکہ ناول زندگی کی متنوع خصوصیات کو پیش کرنے کا اہم وسیلہ ہے۔ زندگی کے ہر طرح کے حقائق کا فہم حاصل کرنے اور ان کے ابلاغ کے لیے ناول سب سے معتبر صنف سخن ہے۔ ناول زندگی کے رائج تصورات یا رویوں میں تبدیلی کی کوشش کرتا ہے اور ہمارے علم میں اس قسم کا اضافہ کرنے کا دعوے دار ہے کہ ایک مخصوص دور میں سیاسی، معاشی، سماجی، تہذیبی، عمرانی تبدیلیوں کے باعث انسان کی صورت حال، انسانی روح یا انسانی دماغ و ذہن میں وقوع پذیر ہونے والی باتوں سے آگاہی دلاتا ہے۔ جیسا کہ منشی پریم چند کے ناول "گئودان" سے ادب کے قاری کو اعداد و شمار تو حاصل نہیں ہو سکتے کہ کسی گاؤں میں کتنے انسان مقروض تھے اور ان کا مجموعی قرض کس قدر تھا لیکن یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ قرض کے بوجھ تلے دبے ہوئے کسانوں کے دل و دماغ پر کیا گزرتی ہے اور ان کا باہمی تعامل کیسا ہوتا ہو گا یعنی اس ناول کے ذریعے جاگیر دارانہ طبقاتی نظام میں پسے ہوئے مقروض کسانوں کی شخصیت کو سمجھا جا سکتا ہے۔

کسی بھی عہد کی فکریات اور روایات میں مختلف جہات اور رویوں کا اظہار ہوتا رہتا ہے مگر کوئی ایسا رویہ یا عمومی فکر جسے عمومی قبولیت کی سند حاصل ہو ی ایسا رجحان جو کسی خاص عہد کے عام اذہان کو متاثر کر رہا ہو روح عصر کہلاتا ہے۔ عابد حسن منٹو کے بقول:

> "ہر دور میں چند ایسی بنیادی خصوصیات موجود ہوتی ہیں جو کم و بیش ہر شخص کو متاثر کرتی ہیں۔ یہی خصوصیات اس دور کا طرۂ امتیاز ہوتی ہیں اور انھی کے اظہار کو ادب میں روح عصر کہا جاتا ہے"۔(۴)

اردو ادب میں سر سید کی عقلی تحریک یا ترقی پسند تحریک کے مقصدی ادب کا ہنگامہ اپنے عصر کے نمایاں رُجحانات کی قبولیت کی نہایت عمدہ مثالیں ہیں۔ اردو ناول بھی اپنے عصری رُجحانات سے متاثر ہوتا رہا ہے۔ ناول کا منظر نامہ چونکہ زیادہ وسیع ہوتا ہے اس لیے روح عصر کی نمود کا امکان ناول میں دیگر ادبی اصناف کی نسبت زیادہ ہوتا ہے۔ ادب کی کوئی بھی صنف ہو وہ رُجحان زمانہ سے متاثر ہوتی ہے اور یہی بڑے ادب کا خاصہ بھی ہے۔ مصنف نے اس کتاب کے اوّلین باب میں داستان اور ناول کے اجمالی مطالعے اور اُردو میں ناول کے فروغ کے مختصر جائزے کے بعد ناول کی چند متفرق تعریفات کو عصریت اور اُردو ناول کے باہمی تعلق کو ثابت کرنے کے لیے شامل کیا اور پھر۔ناول کو عصری آگہی کی یافت کا بنیادی اور بہترین

ماخذ قرار دیا ہے۔ کسی خاص عصر کی شناخت اُس عصر کے حساس تخلیق کاروں کی تخلیقات میں ہی جلوہ گر ہوتی ہیں۔ جدید عہد میں ناول کی صنف آنے کے بعد کسی بھی عصر کے ہر طرح کے عصری شعور کا اظہار اس صنف میں ہونے لگا۔ اردو ناول نگاروں کے تخلیق کردہ ناول اس امر کی گواہی مہیا کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ وہ اپنے عہد کے مروجہ افکار و خیالات کے ہی نہیں بلکہ اپنے عہد کی تہذیب و معاشرت کے بھی آئینہ دار ہیں۔

اس کتاب کا ہر باب اپنی الگ اہمیت رکھتا ہے اور ادب کے قارئین اور طالب علموں کی اردو ناول اور عصریت کے باب میں مکمل رہنمائی کا فریضہ احسن انداز میں انجام دیتا معلوم ہوتا ہے۔ کتاب کا دوسرا باب آغاز سے لے کر انیسویں صدی کے اواخر تک کے اردو ناول کے مطالعے پر محیط ہے اور اسے نو آبادیاتی دور، عقلیت پسندی کے فروغ، سر سیّد تحریک کے ردِ عمل اور انیسویں صدی کی تہذیب و معاشرت اور عصریت کی روشنی میں تفصیلی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اردو میں تاریخی ناول میں بھی عصری آگہی کی تلاش کی گئی ہے۔ مصنف نے تحقیقی و تنقیدی اسلوب اختیار کرتے ہوئے اپنی ذاتی ماہرانہ آرا کو بھی دیگر مطالعات کے ساتھ شامل کیا ہے اور مجموعی طور پر نتائج کے استخراج کو ممکن بنانے کی سعی کی ہے۔ جیسا کہ ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کے معاشرتی اصلاحی مقاصد کی بنا پر اُن کی عصری آگہی کے دائرے کو معاشرت تک محدود قرار دیتے ہیں۔ تہذیب و معاشرت کی منتشر عکاسی نذیر احمد اور اُن کے عہد کے دیگر ناول نگاروں کے ناولوں میں دکھائی دیتی ہے مگر چونکہ ان تخلیق کاروں کی تخلیقات میں اصلاح کا جذبہ اور اس مقصد سے شدید لگاؤ اُنھیں تہذیب و معاشرت کے مرقعے پیش کرنے کی اجازت نہیں دیتا البتہ وہ بین السطور ایسی تصاویر رکھتے ہیں جو ان کے عصری شعور کی غماز ہیں۔ نو آبادکاروں کی تہذیبی برتری کے طفیل اس وقت کے سماج میں فعالیت کا احساس کم ہو چکا تھا اور ہر شعبہ زندگی میں مثالیت اور عینیت کا دخل زیادہ تھا اسی لیے نذیر احمد کے ناولوں کے کردار بلاوجہ مثالی نہیں تھے۔ اسی طرح ناول "فسانۂ آزاد" نئی اور پرانی تہذیب کے مابین کشمکش کا اظہاریہ دکھائی دیتا ہے۔ آزاد پرانی تہذیب سے قطع تعلق بھی چاہتا ہے جو کہ عصری رویہ ہے اور نئی تہذیب کو اپنے مزاج سے ہم آہنگ بھی نہیں کر پاتا۔ نو آبادکاروں کی تہذیبی و معاشرتی اقدار اپنانے میں مشکل درپیش ہے اور اپنی تہذیبی و سماجی اقدار کی لغویت یا عصریت بدلنے سے اُن کی بے معنویت انھیں اپنانے سے گُریز پر مجبور کرتی ہے۔ ناول کا کلیدی کردار "آزاد" عشق بھی کرتا ہے اور لکھنوی مزاج کے مطابق عشق بازی بھی کرتا ہے۔ یہ کردار لکھنو کے ادبار کا

سامنا کرنے سے ہچکچاتا ہے مگر روم اور روس کی جنگ میں شرکت کو اپنی دلیری کا لازمی جزو سمجھتا ہے۔ سرشار کے دیگر ناولوں کی نسبت مصنف نے ''فسانۂ آزاد'' کو داستان سے ممیز کرنے والی چیز یعنی خواب و خیال کی دنیا کے بجائے لکھنو کی حقیقی دنیا کی پیشکش کے باعث عصریت سے بھرپور ناول قرار دیا ہے۔

مصنف نے لکھنوی سماج کے حوالے سے دوسرے اہم ناول ''امراؤ جان ادا'' کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے یہ بیان کیا کہ اس ناول میں ناول نگار نے اس زمانہ کی حقیقی زندگی اور سماج میں نو آبادیاتی نظام اور اس کے بد اثرات کا اظہار بہروپیوں اور ڈاکوؤں کی کثرت سے کیا ہے، جس کی ایک وجہ اقتصادی بد حالی ہے۔ نو آبادکار سامراج یعنی انگریز اس تہذیبی انتشار اور اس سے پیدا ہونے والے بگاڑ کو دیکھ رہے تھے مگر اس صورتحال کا تدارک کرنے کے بجائے خاموشی سے معاشی استحصال میں مگن تھے۔ مصنف نے نہایت عمدگی سے اس ناول کا تجزیہ پیش کیا کہ اس ناول میں غدر سے لے کر انیسویں صدی کے آخر تک کے لکھنؤ کی جھلکیاں موجود ہیں۔ غدر سے قبل کا لکھنؤ اپنی پوری تہذیبی عصریت کے ساتھ دکھائی نہیں دیتا مگر غدر کے بعد کی عصریت کا اظہار مرزا رسوا نے خوب کیا ہے۔ رسوا کا تہذیبی و سماجی شعور لکھنوی زوال پذیر تہذیب کو امراؤ جان ادا جیسی نستعلیق طوائف کی آنکھ سے دکھاتا ہے، جو کہ اُن کی فن کاری اور چابکدستی کا ثبوت ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ رسوا ان اسباب کو بھی اس ناول میں زیر بحث لائے ہیں جو لکھنوی تہذیب کے زوال کا باعث ہیں۔ یعنی مختصر الفاظ میں ہندوستان محض برطانوی سامراج کے لیے خام مال کی پیداوار کا ذریعہ اور تجارتی منڈی کی حیثیت رکھتا تھا، رسوا اس بات کا شعور بخوبی رکھتے تھے۔ مصنف کے مطابق ڈپٹی نذیر احمد سے لے کر مرزا ہادی رسوا تک برصغیر کی تہذیبی و سماجی زندگی میں آنے والا تغیر اور نئے امکانات سب کے پیش نظر رہے لیکن ان ناول نگاروں کی تخلیقات میں مزاحمتی عنصر کم یا سرے سے ناپید ہے اور نئی جنم لینے والی صورت حال کی قبولیت کا جذبہ زیادہ دکھائی دیتا ہے۔

مصنف نے اردو میں تاریخی ناول اور عصری آگہی کے عنوان کے تحت اردو میں تخلیق کیے جانے والے تاریخی ناولوں کا تفصیلی جائزہ پیش کرنے کے بعد نذیر احمد کے ناول ''ابن الوقت'' کو عصری شعور کا حامل ناول قرار دینے کی توجیحات پیش کیں کہ نذیر احمد مسلمانوں کی سیاسی برتری کا خواب دیکھ رہے تھے اور اب سیاسی ابتری ان کے محکوم ہونے میں تھی۔ اس حوالے سے اُن کا تاریخی شعور اپنے عصر سے ہم آہنگ تھا کیونکہ ہندوؤں کے لیے تو محض حکمران طبقہ تبدیل ہوا تھا جبکہ مسلمانوں کے لیے یہ مکمل

سیاسی و تہذیبی بدلاؤ تھا۔ نذیر احمد اس تاریخی عمل کو ایک خاص زاویہ نظر سے دیکھ رہے تھے اور ان کے پیش نظر ۱۸۵۷ء کے قریب کا عصر تھا لہٰذا یہ ناول عصری تاریخ کا حامل ہے۔

مصنف نے عبدالحلیم شرر کے معاشرتی ناولوں کی نسبت اُن کے تاریخی ناولوں کو بہتر قرار دیا کہ اردو ناول نگاری میں ان کے مقام و مرتبے کے تعین میں بھی مددگار ہیں۔ ان ناولوں خصوصاً ''فردوس بریں'' کے ذریعے شرر نے اردو ناول نگاری کو ایک نئی سمت سے رُوشناس کرایا اور اپنے عہد کی روح عصر کو بھی ان میں سمونے کی کوشش کی۔ وہ اُس عصری شعور سے ہم آہنگ تھے جو سرسید تحریک کا پیدا کردہ تھا۔ راشد الخیری کے تاریخی ناول نما قصوں کے حوالے سے مصنف کا کہنا ہے کہ شرر کے تتبع میں راشد الخیری نے بھی تاریخی واقعات کے ساتھ ساتھ رومانوی واقعات کو بیان کیا ہے مگر ایک تو اُن کے رومانوی واقعات تاریخیت سے مربوط نہیں ہیں اور دوسرے اُن کا تاریخی شعور اپنے عصر سے ان واقعات کا ربط تلاش کر پاتا ہے۔ بعد ازاں تاریخی ناول نگاری کے باب میں مزید چند ناول نگاروں کے بارے میں مصنف نہایت صائب رائے قائم کرتے ہیں کہ ان سب ناول نگاروں کے تخلیقی فن پر معاشرتی و سماجی اثرات نذیر احمد اور سرسید تحریک کے ہیں اور ان فنکاروں کے ہاں تاریخی شعور اپنے عصری تقاضوں سے ہم آہنگی کا حامل نہیں۔

اس کتاب کا تیسرا باب بھی بے حد اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس میں ''اردو ناول میں جدید فکری رجحانات: عصری آگہی'' کے عنوان کے تحت جدید ادبی نظریات اور جدید ادبی تحریکوں جیسے رومان نگاری، حقیقت نگاری، مارکسی حقیقت نگاری، ترقی پسندی اور نفسیاتی رجحانات کے پس منظر میں اردو ناول کا جائزہ لیا گیا ہے۔ رومانویت کے ابتدائی مباحث اور تخلیقات مغرب میں سامنے آئیں اور مغربی ادب پر رومانویت کے اثرات بہت عرصہ تک قائم رہے۔ اُردو ادب میں بھی رومانوی رُجحانات مغرب سے مستعار اور متاثر ہیں۔ مصنف نے اس باب کے ابتدائی حصّے میں اُردو ادب بالخصوص ناول پر رومانویت کے اثرات کا محاکمہ پیش کیا ہے۔ ادبی سطح پر رومانویت کا ردّ عمل حقیقت نگاری کی صورت میں ہوا۔ حقیقت نگاری دراصل کوئی اچانک ظاہر ہونے والا رُجحان نہیں بلکہ اس کے پس منظر میں سرسید تحریک کی مقصدیت اور استدلالیت کارفرما نظر آتی ہے۔ جمال نقوی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> ''اردو ادب میں حقیقت نگاری اور روشن خیالی کی ابتدا بادی النظر میں سرسید احمد خان کی علی گڑھ تحریک سے ہوتی ہے۔ اسی تحریک نے موضوعات کو وسعت بخشی، بیان

کی سلاست اور سادگی پر زور دیا اور اسالیب کو ایک تعمیری اور بامقصد ادب کی تخلیق کا ذریعہ بنایا۔ اس ادب کی بنیاد عقلیت اور حقیقت پسندی پر تھی"۔(۵)

حقیقت نگاری کے مباحث میں کارل مارکس اور اینگلز نے اضافے کیے اور تاریخی مادیت و جدلیات کی فلسفیانہ اصطلاحات متعارف کرائیں۔ جن سے نہ صرف فلسفے میں جوہری تبدیلیاں پیدا ہوئیں بلکہ ادب بھی نئے تصورات سے آشنا ہوا۔ اشتراکی ناقدین کے خیال میں ادب برائے ادب کا نظریہ سماجی عکاسی نہیں کرتا جبکہ اس کے برعکس اشتراکی حقیقت نگاری طبقاتی کشمکش کو ادب کا محرک قرار دیتی ہے۔ گویا ادب کی مادی نقطہ نظر سے ترویج کو اشتراکی حقیقت نگاری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اشتراکی حقیقت نگاری کی وضاحت "کشاف اصطلاحات فلسفہ" میں یوں کی گئی ہی:

"آرٹ کے متعلق انقلابی نظریہ جو بیسویں صدی میں پیدا ہوا۔ اس کا منشا مارکسی نقطہ نگاہ سے زندگی کی عکاسی کرنا ہے۔ لہٰذا اس میں کمیونسٹ آئیڈلوجی کو آشکار کیا جاتا ہے اور محنت کشوں کی جدوجہد ظاہر کی جاتی ہے۔ اس آرٹ کا انحصار معاشرتی انسان دوستی، بین الاقوامیت، تاریخی رجائیت اور صوریت اور موضوعیت کے افکار پر ہے۔"(۶)

مارکسی فکر کے نتیجے میں اشتراکی انقلاب اور اشتراکی نظریات کو فروغ ہوا اور بہت سے روسی ادبا ٹالسٹائی، ترگنیف، میکسم گورکی اور مایاکافسکی وغیرہ اشتراکی نظریات کی ترویج کا باعث بنے۔ یہ نظریات عالمی سطح پر ادبا کو متاثر کرنے لگے۔ ہندوستان میں اشتراکی نظریات کے فروغ کا ایک بڑا سبب پہلی جنگ عظیم کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اقتصادی بدحالی اور انقلابِ روس سے پیدا ہونے والی اُمید بنے۔ یہی وہ عوامل تھے جو جلد ترقی پسند تحریک کی بنیاد بنے اور پھر افسانوی مجموعے "انگارے" کی ۱۹۳۲ء میں اشاعت اور بعد ازاں اس پر پابندی نے ترقی پسند تحریک کی راہ ہموار کر دی۔ اس کے افسانہ نگاروں نے سماجی حدود و قیود کو توڑتے ہوئے معاشرے کی کھوکھلی اقدار کو زک پہنچائی۔ اُردو میں انقلابی تخریب کے اولین اہم کارنامے "انگارے" کی اشاعت سے نئے ادب نے خود مختاری کا علم بلند کیا اور یہ سماج پر پہلا وحشیانہ حملہ ثابت ہوا۔ عزیز احمد اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> ""انگارے" کا سب سے بڑا نقص احتیاط کا فقدان اور بے اصولی کی انتہا پسندی تھی۔ اسی وجہ سے اس کتاب کا تخریبی مقصد تو پورا ہو گیا لیکن یہ کوئی تعمیری کام نہ کر سکی"۔(۷)

خود حقیقت نگاری، سماجی حقیقت نگاری وغیرہ نے بھی ترقی پسند تحریک کے لیے فضا ساز گار بنا رکھی تھی۔ مزید فکری سطح پر اختر حسین رائے پوری کا مقالہ "ادب اور زندگی" ۱۹۳۵ء میں کی اشاعت نے ترقی پسند تحریک کے قیام کی زمین ہموار کرنے میں بہت معاون ثابت ہوا۔ ۱۹۳۶ء میں لکھنو میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا باقاعدہ قیام عمل میں لایا گیا اور اس کے پہلا جلسہ کے روح رواں سید سجاد ظہیر تھے جبکہ جلسے کی صدارت پریم چند نے کی۔ اس کانفرنس میں انجمن کا باقاعدہ ایک منشور منظور کیا گیا اور ادیبوں پر زور دیا گیا کہ وہ ہندوستانی سماج کے تقاضوں، ضروریات اور آنے والی تبدیلیوں کا کُھل کر اظہار کریں اور ادب میں سائنسی عقلیت کو فروغ دیں۔ اس کانفرنس کے بعد ترقی پسند تحریک کے افکار و نظریات پورے ہندوستان میں زور و شور سے ترویج پانے لگے اور ہندوستان بھر کے ادیبوں کو متاثر کرنے لگے۔ اس تحریک نے ادب کو معاشرتی زندگی کا آئینہ دار قرار دیا اس لیے شاعری اور افسانے کے معاشرتی زندگی کی نا ہمواری اور طبقاتی کشمکش خاص موضوع بن گئے۔ افسانہ، ناول اور شاعری میں مزدوروں، محنت کشوں اور نچلے طبقات کی زندگی کے مختلف مسائل اور پہلوؤں کو پیش کیا جانے لگا جبکہ سرمایہ داری کو براہ راست تنقید کا نشانہ بنایا جانے لگا۔ یہ تحریک نہ صرف سماج میں ایک تحرّک کا سبب بنی بلکہ اس سے اُردو ادب بھی نئے موضوعات سے رُوشناس ہوا۔

ترقی پسند ادیبوں نے نچلے پِسے ہوئے طبقات کو اہمیت دی۔ اس ادب میں سماجی حقیقت نگاری کا رُجحان غالب نظر آنے لگا۔ ترقی پسند ادیبوں سے قبل کے ادب میں خصوصاً ناول میں سماجی حقیقت نگاری کی مثالیں موجود ہیں جیسے پریم چند کے ناول لیکن ان انفرادی کاوشوں کی جگہ ترقی پسند تحریک کی اجتماعی اور منظّم کوششوں نے ادب میں ایک خاص نوع کی تبدیلی پیدا کر دی۔ سیاسی و سماجی حقیقت نگاری کے اس شعور نے ادب میں بھی حقیقت نگاری کو فروغ دیا۔ ہندوستان کی اس مخصوص سیاسی و سماجی صورتحال کی عکاسی اور نمائندگی ادب میں بالخصوص پریم چند نے زیادہ موثر پیرائے میں کی ہے۔ ہندوستانی عوام کے سیاسی شعور اور انسانی حقوق کے ادراک نے پریم چند کی فکری ساخت کو متاثر کیا۔ اُن کی ادبی زندگی کے آغاز اور ہندوستان کے مخصوص معاشرتی تناظر کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر محمد عارف کا کہنا ہے:

''تصانیف پریم چند کا عہد:۳٦-۱۹۰۱ء ہے۔ یہ نہایت ہنگامہ خیز دور ہے۔ جس میں بتطانوی سامراج کا بھیانک چہرہ بری طرح بے نقاب ہوا۔یہی وجہ ہے کہ ''بیوہ''، ''بازارِ حسن'' اور ''نرملا'' کو چھوڑ کر، پریم چند کے سب ناول نیم انقلابی تصور آزادی کے ترجمان ہیں۔ بہر حال فکر و عمل کی آزادی کے حوالے سے افکارِ تازہ اور مغربی ناول کا فکر و فن، ان کی نگارشات کا قلب و جاں ہیں''۔(۸)

پریم چند صرف ایک ناول نگار ہی نہیں بلکہ وہ ناول نگاری کا ایک عہد ہیں۔ جس قدر ذہنی ارتقا پریم چند کے ہاں ملتا ہے اس کی مثال اُردو کے کسی اور ناول نگار کے یہاں نہیں ملتی۔ ''اسرار معابد'' سے لے کر ''گئو دان'' تک ایک طویل فنی سفر نظر آتا ہے۔ پریم چند سے قبل کے اُردو ناولوں میں بالعموم شہری طبقات اور ماحول کی عکاسی تو کی گئی تھی لیکن دیہاتی زندگی موضوع نہیں بنی تھی اور نہ ہی ہندوستان کی سیاسی و سماجی یا اقتصادی حالات ناول کا موضوع بن پائے تھے۔ پریم چند کے ناولوں میں عام طبقات کے مسائل ملتے ہیں جبکہ ان سے قبل کے ناولوں میں متوسط یا اشرافیہ طبقات ناول کا موضوع تھے۔ پریم چند کے ناولوں میں زیادہ تر سماجی برائیوں اور قباحتوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ''میدان عمل'' اور ''گئودان'' ان کے سیاسی شعور کے آئینہ دار ناول ہیں۔ پریم چند کا آغاز جس اصلاح پسندی کے جذبے سے ہوا تھا اُس نے آخری دور میں یہ نتیجہ اخذ کر لیا تھا کہ زندگی مثالی آدرشوں کی جدوجہد میں تو گزر سکتی ہے لیکن محض مثالیت کا شکار ہو کر سماجی صورتحال میں حقیقی تبدیلی نہیں لائی جا سکتی۔ پریم چند کی حقیقت پسندی کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر یوسف سرمست لکھتے ہیں:

''پریم چند کی ناول نگاری ہندوستان کے سیاسی و سماجی مسائل سے وابستہ ہو کر خوب سے خوب تر ہوتی گئی اور آخیر میں کروڑ ہا باشندوں یعنی دیہاتیوں کی زندگی کو اور ان کے طبقاتی سماجی اور معاشی پس منظر میں پیش کر کے اور ناول کو حقیقت نگاری اور زندگی کی وسعتوں اور پہنائیوں کو سمیٹنے کا سلیقہ سکھا ہے''۔(۹)

اس ضمن میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ''نیا سماجی و سیاسی تناظر اور اردو ناول: پریم چند کا خصوصی مطالعہ'' کے عنوان سے پریم چند کے ناولوں میں عصری آگہی کے عناصر کا خصوصی تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ اس باب میں مصنف نے پریم چند کے ناول ''گئودان'' کا بھرپور تجزیہ کرتے ہوئے اس کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کیا ہے۔ اُن کی رائے ہے کہ اپنے عصر کی شناخت اور اس کا بیان اس ناول میں زیادہ نمایاں

ہو کر سامنے آیا ہے۔ ''گئو دان'' اپنے موضوع کے اعتبار سے جبر و استحصال کے قائم نظام اور اسے قائم رکھنے والی قوتوں کے خلاف ذہنی بغاوت کا علامیہ ہے۔ پریم چند نے اس ناول میں اپنے عہد کے کسانوں کی معاشی و سماجی اور تمدنی صورتحال کے ساتھ متوسط طبقے کی ذہنی تبدیلیوں اور رویوں کو ملکی سیاست کے تبدیل ہوتے ہوئے رجحان کے پس منظر میں دیکھا ہے۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں ہندوستان کے نچلے طبقات جس غلامی کا شکار رہے ہیں، نو آبادکار سامراج کی آمد سے اس غلامی کے احساس میں شدّت پیدا ہوئی۔ ان سب حالات و واقعات کی تصویر کشی ''گئودان'' میں زیادہ بہتر اور واضح انداز میں ہوئی ہے۔ یہ ناول محض ہوری اور اس قبیل کے دیگر کسانوں کے المیے کا بیانیہ نہیں بلکہ جبر و استحصال کے اس نظام کو کندھا دینے والے ماتا دین اور داتا دین جیسے کرداروں کو بھی اس ناول میں پیش کیا گیا ہے۔ ناول کا کردار گوبر چونکہ گاؤں سے شہر آجاتا ہے اور یہاں مزدور یونین کا لیڈر بن جاتا ہے لہٰذا ہوری کے حالات کے ساتھ ساتھ گوبر کے حالات دکھانے کے لیے شہری زندگی کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ لیکن چونکہ پریم چند کو شہری زندگی کا براہ راست تجربہ نہیں تھا لہٰذا وہ شہری زندگی کی عکاسی خوبی سے نہ کر پائے۔ ناول میں ہندوستانی معاشرت کے اہم مسائل جیسے بے جوڑ شادیاں بھی اُجاگر کیے گئے ہیں۔ نو آبادیاتی نظام کے موثر ہتھیار پولیس، جو امن و امان قائم رکھنے کے نام پر ناانصافی کا استعارہ بن چکی تھی۔ اس ناول میں پریم چند پولیس اور دیگر ریاستی اداروں کے استحصالی اقدامات کا پردہ بھی چاک کرتے ہیں۔

مصنف نے اُردو کی مختلف تحریکوں ترقی پسندیدیت اوراشتراکیت کے زیر اثر تخلیق کیے جانے والے ناولوں کے انفرادی مطالعات پیش کیے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اُردو کے تین اہم ناولوں ''لندن کی ایک رات''، ''گریز'' اور ''اداس نسلیں'' میں مرکزی کردار یعنی ہیرو کے نام کی مماثلت کو محض اتفاقی قرار دیتے ہیں۔ اس میں ضمن میں اُن کا خیال ہے کہ ان کرداروں کے تخلیق کار ایک جیسے تخلیقی احساس کے حامل ہیں اور ان کی فکر اور تجزیاتی عمل میں بھی اشتراکات موجود ہیں۔ ان تخلیق کاروں کا سیاسی و سماجی شعور اپنے عصر کی آگہی رکھتا ہے۔ اشتمالی انقلاب کی افادیت، سیاسی ذہن کی تبدیلی، عصری سماجی صورتحال میں روایت پرستی کے خلاف بغاوت، سامراج کی مخالفت، آزادی کی خواہش وغیرہ وہ عناصر ہیں جو اس عہد کے سیاسی ذہن کی تشکیل کر رہے تھے۔ یہ تینوں ناول نگار برصغیر کے تاریخی و تہذیبی پس منظر اور اس کی مبادیات پہ ایک جیسا تخلیقی شعور رکھتے ہیں، ''اداس نسلیں'' کا نعیم اور اس کے تضادات دیگر دو کرداروں کی نسبت شدید ہیں کیونکہ یہ اس عہد کے تضادات بھی ہیں۔ تینوں کردار وقت کی دُھول میں گُم ہو کر بے چہرہ

ہو جاتے ہیں گویا تینوں ہی کسی وجودی مسئلے کا شکار ہو جاتے ہیں اور ان کا انجام بھی ایک جیسا ہی نظر آتا ہے۔

مصنف نے اس باب میں نہایت عمدگی سے اہم ادبی تحریکوں ترقی پسندیدیت اور مارکسزم یعنی اشتراکی انقلابیت کے تحت ناول نگاروں کے ناولوں میں عصری شعور کی تلاش اور تجزیہ نگاری کی ہے، جس کا مطالعہ ادب کے قارئین بالخصوص اردو زبان و ادب کے طلبا کی تہذیب و تربیت کے ضمن میں سُود مند ثابت ہو گا۔

ناول اپنے عصر کے نمایاں رُجحانات کو سمونے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔اسی لیے ناول قیام پاکستان کے مرحلے پر دیگر اصنافِ ادب کی طرح نئی عصری صورتحال کی عکاسی بخوبی کرتا دکھائی دیتا ہے ۔ڈاکٹر کامران عباس کاظمی نے اس کتاب کے چوتھے باب میں تحریک آزادی، ہجرت، فسادات کے اُردو ناول پر اثرات کا اجمالی جائزہ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اردو ناول کا پاکستانی دور اور عصری شعور پر بھی پُر مغز اور تفصیلی مطالعہ پیش کیا ہے۔پاکستانی اردو ادب کے قارئین کے لیے پاکستانیت کے شعور اور اردو ناول کے ربط سے آگاہی نہایت اہم ثابت ہو گی۔

فسادات اور تقسیم برصغیر کا موضوع اکثر ناولوں کا پس منظر بنا بلکہ قیام پاکستان کے بعد لکھے گئے بیشتر ناولوں کا موضوع تقسیم، فسادات اور نئی توقعات ضرور بنے البتہ پاکستانی عہد کے ناول میں پاکستانیت کا شعور، نئی مملکت کے مسائل، ریاستی اختیار و اقتدار، سیاسی و سماجی نظام، نئی ریاستی اکائیوں کے ثقافتی امتزاج، نظریہ اور نظریاتی کشمکش، ہجرت اور اس کے ساتھ جُڑے ہوئے دکھ، نئی اقدار کی تلاش، شہری و دیہی ماحول کے امتیازات، حکمرانوں کی مفاد پرستی، عالمی سطح پر جنگ کے اثرات وغیرہ موضوع بنے۔ناول چونکہ اپنے عصر کی مکمل یا جامع نفسیاتی، سماجی، عمرانی، تہذیبی اور سیاسی صورتحال وغیرہ کی عکاسی تمام جزئیات اور تفصیلات کے ساتھ پیش کرنی کی صلاحیت سے مزین ہوتا ہے لہٰذا کسی خاص عصر کے سماجی ، تہذیبی اور دیگر رویوں سے آگہی اس عہد میں تخلیق کیے گئے ناولوں سے ہوتی ہے۔گویا ناول اپنے عہد کا رزمیہ ہوتا ہے۔پاکستانی عہد کا ناول بھی پاکستان کے سماجی، سیاسی، جغرافیائی اور عالمی برادری میں پاکستانی ریاستی و سماجی اہمیت کی دستاویز ہے۔اس کے ساتھ ساتھ پاکستانی علاقائی اراضی کی تاریخ، ماضی کی روایات، تاریخی شعور، تاریخیت اور ان کے ہنگام وپیدا ہونے واے انسانی المیے بھی پاکستانی عہد کے ناول کا موضوع بنتے رہے ہیں۔اسلوب کی سطح پر بھی زبان و بیان کے نت نئے تجربات پاکستانی ناول میں صاف

جھلکتے ہیں۔ زبان جس کا مرکز لکھنو تھا، اب لاہور و دیگر علاقائی خطّے قرار پانے کے باعث مقامی تہذیب و معاشرت کا اظہار زبان میں بھی تبدیلی کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

پاکستانی عہد کے ناول نگاروں میں دیگر اصنافِ ادب کی مانند دو طرح کے تخلیق کار شامل ہیں ۔اولاً جو ہندوستانی عاقوں سے ہجرت کر کے آئے، ان میں عزیز احمد بطور ناول نگار اپنی شناخت رکھتے تھے جبکہ احسن فاروقی اپنی شناخت بنانے کے لیے کوشاں تھے۔ بعد ازاں معروف اسما میں قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین شامل ہیں۔ دوسری طرح کے تخلیق کاروں میں وہ نام شامل تھے جن کا تعلق تاریخی و تہذیبی اعتبار سے پاکستان کے موجودہ علاقوں سے تھا۔ ابتدا میں دونوں طرح کے تخلیق کاروں کی تخلیقات میں تہذیبی امتیازات واضح تھے جو وقت کے بہاؤ میں آ کر کم ہوتے چلے گئے۔

قیام پاکستان اور اس کی جدوجہد کے اثرات اُردو ادب پر بھی مرتب ہوئے۔ خاص طور پر تشکیل پاکستان کے بعد لکھے جانے والے ادب میں تحریک آزادی کے المیوں پر زیادہ لکھا گیا البتہ اس میں ناول کا حصہ بوجوہ کم ہے۔ اس عہد میں جتنا بھی ناول تخلیق ہوا، اس میں تحریک آزادی اور فسادات جیسے موضوعات کا احاطہ تاریخی و سماجی شعور کی روشنی میں کیا گیا۔ ڈاکٹر رؤف پاریکھ قیام پاکستان کے اثرات کا اُردو ادب پر جائزہ لیتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> ”قیام پاکستان سے اردو ادب کی تخلیق پر نمایاں اور دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ مثلاً اردو ادب جو پہلے سیاسی طور پر متحدہ ہندوستان میں تخلیق ہو رہا تھا، اب دو علیحدہ ملکوں میں تخلیق کیا جانے لگا۔ یہ دو نئے ملک جو پہلے سیاسی طور پر ایک تھے اب سیاسی طور پر علیحدہ علیحدہ وجود رکھنے لگے، لیکن ان کی علیحدگی محض سیاسی نہ تھی۔ یہ دو نظریات ،دو قوموں اور دو تہذیبوں کی علیحدگی تھی۔ اب دونوں ملکوں کے سیاسی، سماجی، معاشی، تہذیبی، لسانی، مذہبی، نظریاتی اور ادبی ماحول میں فرق تھا اور یہ فرق روز بروز بڑھتا گیا۔ لہٰذا اس کے اثرات لامحالہ ادب پر۔۔۔ بھی پڑے“۔(۱۰)

ادیب کا اپنی عصریت سے آگاہ ہونا اس کے سماجی، سیاسی اور تہذیبی شعور کے طفیل ہی ممکن ہوتا ہے۔ اُردو ناول کا پاکستانی دور زیادہ بہتر انداز میں عصری شعور کا حوالہ بنتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ امر قابل غور ہے کہ اردو ناول میں جدوجہد آزادی، تحریک پاکستان، نو آبادیاتی استحصال اور فرد کی آزادی اور غلامی کو شدت سے موضوع نہیں بنایا گیا، تقسیم سے قبل کے ناول میں محکومی کا احساس تو ملتا ہے مگر آزادی کی

جدوجہد اور راستے کا تعین کہیں نظر نہیں آتا۔ تقسیم کے بعد کے ناولوں میں البتہ جدوجہد آزادی کی تصویر ملتی ہے تاہم واضح سیاسی بصیرت کے ساتھ تحریک پاکستان کا اظہار کم ہی کسی ناول میں ہوا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر کامران کاظمی نے حیات اللہ انصاری کے پانچ جلدوں پر مشتمل ناول "لہو کے پھول" کا ذکر کیا ہے جو تحریک پاکستان کو موضوع بناتا ہے۔ انھوں نے اس ناول کو واقعاتی ناول قرار دیا کیونکہ یہ ناول ایک خاص عصر کے مخصوص واقعات کا احاطہ کرتا ہے اور اس میں چند کرداروں کے ذریعے سے ایک محدود عصر کے حالات و واقعات اور سماجی و سیاسی صورتحال کی عکاسی کی گئی ہے۔ مصنف نے تقسیم کے موجوع پر لکھے گئے ناولوں کو دو بنیادی اقسام میں منقسم کیا ہے، ایک ایسے ناول جو فوری جذباتی ردّ عمل کی پیداوار ہیں۔ ان ناولوں میں اعلیٰ تخلیقی و فنی مقاصد بروئے کار نہیں آئے بلکہ ان کی بنیاد واقعیت پر رکھی گئی ہے۔ یہ ناول فسادات کی بہیمیت، انسانی درندگی اور وحشت کی عکاسی کرتے ہیں۔ مہاجرین کی ناگفتہ بہ حالت ان ناولوں کا موضوع ہے گویا شدید جذباتیت اس قسم کے ناولوں کی فنی حیثیت کو کمزور کر دیتی ہے۔ دوسری قسم کے ناول وہ ہیں جن میں فسادات کا زیادہ گہرائی میں جائزہ لیا گیا ہے اور ان میں جذباتیت کا عنصر کم ہے۔ تقسیم کے محرکات، جدوجہد آزادی، سیاسی جماعتوں کے کردار، فرقہ وارانہ تعصّب اور مہاجرین کے مسائل اس قسم کے ناولوں کا موضوع بنتے ہیں۔ ان میں سے بھی بعض ناولوں کا موضوع تقسیم اور اس سے وابستہ دیگر موضوعات نہیں تھے جیسا کہ قرۃ العین حیدر کا ناول "آگ کا دریا" لیکن تاریخی تسلسل اور قصہ کے بہاؤ میں فسادات بھی موضوع بنے ہیں۔ اس کے برعکس خدیجہ مستور کے ناول "آنگن" میں تحریک پاکستان، فسادات، ہجرت اور نئی سرزمین سے ہم آہنگی کی کوشش وغیرہ زیادہ تفصیل سے موضوع بنے ہیں۔ جمیلہ ہاشمی کا ناول "تلاش بہاراں" اور عبداللہ حسین کا ناول "اداس نسلیں" تقسیم کے کافی مدت بعد لکھے گئے مگر ان ناولوں میں فسادات کو پس منظر کے طور پر موضوع بنایا گیا اور قصہ کی بنیاد فسادات کے ماقبل یا مابعد واقعات پر رکھی گئی ہے۔

مصنف کے مطابق اردو ناول نگاری میں دورانِ ہجرت پیش آمدہ واقعات کو کسی بڑے ناول نگار نے سوائے عبداللہ حسین کے موضوع نہیں بنایا۔ اس ضمن میں اُنھوں نے مثالیں پیش کی ہیں جیسے قرۃ العین حیدر ہجرت کا المیہ گہرے ثقافتی کرب کے ساتھ بیان کرتی ہیں مگر ان کے کردار قافلوں کے ساتھ سفر کرنے کے بجائے ہوائی جہازوں کے ذریعے اپنے نئے مقام تک پہنچتے دکھائی دیتے ہیں۔ اسی طرح خدیجہ مستور کے کردار بھی اچانک لاہور نمودار ہو جاتے ہیں اور نسبتاً سہل زندگی یہاں بھی اُن کی منتظر

ہوتی ہے۔ قافلوں کے ساتھ سفر، لوٹ مار، قتل و غارت گری، بھوک پیاس کی شدت، خواتین کی بے حُرمتی جیسے موضوعات اردو افسانے کا خوب حصہ بنے ہیں۔ اس ضمن میں "اداس نسلیں" ایسا ناول ہے جس میں عبداللہ حسین نے ہجرت کرنے والے قافلے کی جامع تصویر کشی کی ہے۔ دورانِ ہجرت کئی خاندان بچھڑ گئے، لاکھوں انسان تباہ حال ہو گئے۔ ناول کے بہت سے کردار دیگر ناولوں کے کرداروں کی مانند ہوائی سفر کر کے اپنے نئے مستقر پر پہنچ گئے مگر ناول کا مرکزی کردار نعیم ایک قافلے میں شامل ہوا۔ یہاں ناول نگار نے قافلے کی صورتحال کی عکاسی بہت خوبی سے کی ہے۔ تقسیم کے پس منظر میں لکھے جانے والے ناولوں میں عبداللہ حسین کا اختصاص یہی ہے کہ اُنھوں نے بے خانماں آباد افراد کی زندگی کی تصویر کشی میں غیر جانبداری کا رویہ برقرار رکھا ہے۔ ہجرت کی پیشکش اور انسانی المیے کے بیان کو سراہتے ہوئے ڈاکٹر خالد اشرف لکھتے ہیں:

> "اس مہاجر قافلے کا ذکر ناول میں تقریباً سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اور ان صفحات میں اس قافلے پر گزرنے والی مختلف ذہنی و نفسیاتی کیفیتوں، راستے میں پیش آنے والی مصیبتوں اور جان و مال کے نقصان کو عبداللہ حسین نے اس قدر مہارت اور نفسیاتی بصیرت کے ساتھ پیش کیا ہے کہ تمام اردو ادب میں ہجرت کرنے والے قافلوں کی اتنی حقیقی تصویر کہیں اور نہیں ملتی"۔(۱۱)

عبداللہ حسین نے "اداس نسلیں" ناول میں ہندوستان کی تقریباً نوے سالہ تاریخ اس ترتیب کے ساتھ بیان کی ہے کہ فسادات اس ماجرے کا لازمی جزو بن کر سامنے آتے ہیں۔ فسادات اور ہجرت برصغیر کی تاریخ میں بہت بڑا انسانی المیہ ہے۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان کے بقول:

> "یوں لگتا ہے کہ تحریک آزادی اور فسادات کے حوالے سے ہمارا ناول ابھی تک "مزید کچھ اور" کی تلاش میں ہے۔ اس لیے کہ سقوط ڈھاکہ نے بھی اس موضوع کو مزید وسعت اور گہرائی عطا کر دی ہے"۔(۱۲)

اُردو ناول کے جدید دور بالخصوص قیام پاکستان کے بعد کے دور میں تہذیبی اور تاریخی شعور کے تین نمایاں رُجحانات سامنے آئے۔ ایک وسطی ہند اسلامی تہذیبی و تاریخی اثرات ہیں، جس سے مراد دہلی اور لکھنوی تہذیب ہے۔ اس پر مدتوں مسلمان حکومتیں قائم رہنے سے ہند اسلامی تہذیب و تاریخ کا ایک بڑا دھارا تشکیل پایا۔ اس تہذیب کا نمایاں اظہار قرۃ العین حیدر کے ناولوں خصوصاً "آگ کا دریا" میں

ہوا۔ گو کہ اس ناول میں گوتم بدھ تہذیب کا عنصر موجود ہے لیکن قرۃ العین حیدر بالعموم تہذیب و تاریخ کو موضوع بناتے ہوئے اسی وسطی ہند اسلامی تہذیب کو موضوع بناتی ہیں۔ ان کے ناولوں میں لکھنوی تہذیب کے علاوہ یورپی تہذیبی اثرات کا بھی غلبہ ہے۔ اسی طرح "گردش رنگ چمن" میں بھی انھوں نے لکھنوی مسلم معاشرت کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ اس ناول میں دو ایسی نسلیں موجود ہیں جن کے سوچنے سمجھنے اور طرز بود و باش میں نمایاں فرق آچکا ہے۔ ایک نسل ماضی اور اس کی تہذیب پر آج بھی جان چھڑکتی نظر آتی ہے جبکہ نوجوان نسل اپنے ماضی سے لاتعلق ہے بلکہ اس کا استہزا اُڑاتی ہے۔ اس کے علاوہ کامران کاظمی نے ڈاکٹر احسن فاروقی کے ناول "شام اودھ" اور انتظار حسین کے ناول "بستی" کا بھی حوالہ دیا کہ اردو ناول میں وسطی ہند کی تہذیبی بازیافت ان ناول نگاروں کے یہاں بالخصوص زیادہ ہے جو ان علاقوں سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ نئی زمین پر آبادکاری کے اپنے مسائل تھے اور جو تہذیب ان کے لاشعور میں رچ بس چکی تھی، فطری امر ہے کہ اس سے گلو خلاصی آسان نہ تھی۔ اس لیے یہ تمام ناول نگار اپنے انھی علاقوں کی تہذیب و تاریخ کو اپنا آدرش قرار دیتے اور اس کا تخلیقی اظہار بھی کرتے ہیں۔

دریائے سندھ اور اس کے اطراف میں جنم لینے والی تہذیب اور تاریخ کا بیان اُن ناول نگاروں کے ہاں موجود ہے، جن کا تعلق جغرافیائی اعتبار سے ان علاقوں سے تھا۔ سندھ ساگر کی تہذیب ہمیشہ بیرانی حملہ آوروں کی زد میں رہی ہے لیکن آخری حملہ آور سامراج یعنی انگریز بنگال کی سمت سے آئے تھے اور یہ علاقے آخر میں اُن کی دسترس میں آئے لہٰذا ان علاقوں پر یورپی اثرات کم مرتسم ہوئے۔ پاکستان کی موجودہ صورتحال میں بھی جاگیر دار طبقہ اقتدار پر حاوی ہے اس لیے اس خطے میں سیاسی شعور کا فقدان ہے۔ سندھ ساگر کی تہذیبی زندگی کو واضح تاریخی شعور کے ساتھ مستنصر حسین تارڑ نے اپنے ناولوں "بہاؤ" اور "راکھ" میں برتا ہے۔ "بہاؤ" ناول دریائے گھاگھرا کے کنارے آباد بستیوں کو زندہ کرتا ہے گویا ناول نگار کے پیش نظر اس خطے کی ہزاروں سال قدیم تہذیب ہے۔ اسی طرح سرسوتی دریا کا تذکرہ ایک پوری تہذیب اور تاریخ کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ ناول تاریخیت سے زیادہ ثقافتی بدلاؤ پر مشتمل ہے۔ جب آریا یہاں آئے اور انھوں نے سندھو کنارے آباد بستیوں کے رہائشیوں کو غلام بنایا اور ذات پات کی تقسیم کا نظام تشکیل دیا تو اس سارے عمل سے ان بستیوں کی آبادیوں پر کیا گزری، یہ تاریخ کا موضوع نہیں ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد "بہاؤ" کے تہذیبی بدلاؤ کے عمل کی وضاحت کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں:

"اس سارے عمل میں یہاں کی بستیوں اور ان کے وسنیکوں پر کیا بیتی اور انھوں نے اس سارے جبر کو کس طرح سہارا، یہ تاریخ کا نہیں ادب کا موضوع ہے کہ ادب بھی ایک معنوں میں اپنے عہد کی تاریخ ہی ہوتا ہے لیکن یہ تاریخی واقعات کے بجائے احساسات اور نفسیات سے متعلق ہوتی ہے۔ 'بہاؤ' دریائے گھاگھرا کے کنارے آباد ایک بستی اور اس کے وسنیکوں کی کہانی ہے لیکن یہ تاریخی واقعات نہیں، بتدریج تباہ ہوتی ایک قوم کی داستان ہے۔۔۔ اس کا جرم یہ تھا کہ وہ زمانے کی بدلتی رُتوں کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ اپنی روایتوں اور پرکھوں کی عظمتوں کے نشے میں سرشار وہ زندگی کو بھی ایک جامد شے سمجھتی تھی"۔(۱۳)

مستنصر حسین تارڑ کے دوسرے اہم ناول "راکھ" کا زمانہ تقسیم کے حالات سے لے کر ۱۹۹۲ء تک کا ہے۔ اس ناول کے پس منظر میں بھی قدیم بدھ تہذیب کے آثار موجود ہیں۔ یہ ناول "بہاؤ" کی اگلی کڑی ہے۔ وہ قدیم تہذیب کے نابود ہونے کا ماجرا ہے جبکہ "راکھ" جدید پاکستانی تہذیب کے نابود ہونے کا قصہ ہے۔ قیام پاکستان کے بعد بجائے اس کے کہ پاکستانی تہذیب کی تشکیل کی جاتی، ایک ایسے سماج کو جنم دیا گیا جو محض مادی آدرش رکھتا ہے اور اس کے حصول کی خاطر وہ کوئی بھی حربہ اختیار کر سکتا ہے۔

سندھ ساگر اسلامی تہذیبی امتزاج کا ایک اور اہم اور نمائندہ ناول مرزا اطہر بیگ کا "غلام باغ" ہے۔ جو کہ اکیسویں صدی میں تخلیق ہونے والا سب سے اہم ناول ہے۔ اس ناول کا موضوع فرد اور تہذیب کے مابین کشمکش ہے۔ ناول نگار نے وادیٔ سندھ کی قدیم تہذیب میں ہزاروں سال قبل متشکل ہونے والے مانگر جاتی کے مہذب قبائل کی تصویر کشی کی ہے۔ یہ خانہ بدوش قبائل ہزاروں سال قبل انسانی تاریخ میں مہذب قبائل کا درجہ رکھتے تھے لیکن یہ تہذیب تاریخی جبر کا شکار ہو کر اس طرح بے شکل ہوئی کہ اب کوئی بھی انھیں تہذیبی تناظر میں مناسب جگہ دینے پر آمادہ نہیں۔ یہ مانگر جاتی ارذل نسلوں کی نمائندہ ہے جس کے نام ناول نگار نے اس ناول کا انتساب کیا ہے۔

اُردو ناول نگاری میں سندھ ساگر تہذیبی رُجحان کا اظہار زیادہ نہیں نظر آتا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ بھی ہے کہ ناول جدید صنف ادب ہے اور اس کا آغاز دہلی اور لکھنو کی تہذیبی فضا سے ہوا ہے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ زیادہ تر ناول نگاروں کا تعلق خود دہلی اور لکھنوی تہذیبی معاشرت سے تھا اس لیے ناول کا تہذیبی دھارا وسطی ہند اسلامی تہذیب کی جانب ہی رہا۔ البتہ سندھ ساگر تہذیبی خطوں سے تعلق رکھنے

والے ناول نگاروں نے اس تہذیب کی قدامت اور انفرادیت کو شناخت کیا اور اپنی تخلیقات کا موضوع بھی بنایا۔

اُردو ناول کا تیسرا تہذیبی رُجحان ماضی کی تہذیبی بازیافت نہیں بلکہ اس کا آغاز قیام پاکستان کے بعد ہوتا ہے۔ اس تہذیبی رُجحان میں خالص پاکستانی ثقافت کو اس کی بوقلمونی سے اخذ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد بہشتر ناول نگاروں نے خالصتاً پاکستانی مسائل کو موضوع بنایا اور ان کے حل کی راہیں متعین کیں۔ ان ناولوں میں چند ایسے ناول جو پاکستانی تہذیب کے نمائندہ ناول کہے جاسکتے ہیں، ان میں عبداللہ حسین کے ناول "باگھ" اور "نادار لوگ"، انتظار حسین کا "آگے سمندر ہے"، بانو قدسیہ کا ناول "راجہ گدھ"، شوکت صدیقی کے ناول "خدا کی بستی" اور "جانگلوس"، شبیر حسین کا ناول "جھوک سیال"، غلام الثقلین نقوی کا ناول "میرا گاؤں"، انیس ناگی کے ناول "دیوار کے پیچھے"، اور "محاصرہ"، انور سجاد کا ناول "خوشیوں کا باغ"، صدیق سالک کا ناول "پریشر ککر"، مرزا اطہر بیگ کے ناول "غلام باغ" اور "صفر سے ایک تک" اور حسن منظر کا ناول "دھنی بخش کے بیٹے" شامل ہیں۔ یہ تمام ناول پاکستانی سیاسی، سماجی اور ثقافتی مسائل کو اپنا موضوع بناتے ہیں۔ ان سبھی ناولوں کا مشترک موضوع دراصل ایک ایسے تہذیبی منطقے کی تشکیل کا خواب ہے جو پاکستان کی تمام اکائیوں اور قومیتوں کے مابین ہم آہنگی کے فروغ کا باعث ہو اور ملکی ترقی و خوشحالی کا ادھورا آدرش مکمل ہو سکے۔

اس کے علاوہ سقوط ڈھاکہ، نظریاتی عدم تشخص کے حوالے سے تخلیق کیے گئے اردو ناولوں کا تنقیدی تجزیاتی مطالعہ اس باب میں شامل کیا گیا ہے اور پاکستانی تہذیبی شناخت اور پاکستانی قومیت کے مسائل کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اکیسویں صدی میں اردو ناول کے عصری آگہی کے ضمن میں امکانات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔

پاکستانی ادب کی حقیقی شناخت کا مسئلہ یہ تھا کہ اردو کی دیگر بستیوں میں تخلیق کیے جانے والے ادب سے پاکستانی ادب کیسے اور کیوں مختلف ہے اور ہم اس تمام ادب کو اردو ادب کہنے کے بجائے پاکستانی ادب کیوں کہنا چاہتے ہیں۔ اس ضمن میں پیدا ہونے والے مختلف سوالات اور مسائل پر مبنی طویل مباحث کو مصنف نے اس باب میں دانش مندی سے بیان کیا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد کے ابتدائی برسوں میں اردو ناول اور بالخصوص اردو افسانے کا بنیادی موضوع فسادات کا المیہ اور اس سے پیدا ہونے والے دیگر مسائل تھے البتہ اس دوران ناول نگاروں کی

توجہ دیگر سماجی مسائل پر بھی مرکوز رہی۔ اس دور کے ناول ''آنگن''، ''آگ کا دریا''، ''زمین''، ''اداس نسلیں'' وغیرہ کے موضوعات تقسیم ہندوستان، نئے ملک کی تشکیل، فسادات تھے مگر ان تخلیقی اذہان نے خوابوں کے ٹوٹنے کے عمل کو بھی موضوع بنانے کا آغاز کر دیا تھا۔ ان سماجی مسائل کو بعد ازاں قیام پاکستان کے بعد اردو ناول میں شوکت صدیقی نے سب سے پہلے موضوع بنایا۔ ان کے ناولوں میں جدید زندگی میں پھیلتی نا انصافی، عدم رواداری، خود غرضی اور سماجی نا آسودگی وغیرہ ناول کی کہانی کو آگے بڑھانے والے موضوعات ہیں۔ اس ضمن میں شوکت صدیقی کا ناول ''خدا کی بستی'' اُن کی ترقی پسند حقیقت نگاری کا غماز ہے، جو تشکیل پاکستان کے بعد کے سماج کی تصویر کشی کرتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام پاکستانی سماج کو اپنی گرفت میں لیتا دکھائی دیتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ سماجی، مذہبی، اخلاقی، اقتصادی یہاں تک کہ خانگی و ازدواجی اقدار بھی بحران کا شکار ہو رہی ہیں۔ سیاست پر براجمان طبقات عوام کے استحصال میں مصروف ہیں اور انتشار اور انارکی کی کیفیت میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ شوکت صدیقی کا سماجی شعور سماجی کی گہرائیوں تک جھانکنے کی صلاحیت رکھتا ہے لہٰذا انھوں نے اپنے عہد کے پاکستانی سماج کو لاحق تمام خرابیوں کی نشاندہی اس ناول میں بخوبی کی ہے۔ اسی طرح مصنف نے جمیلہ ہاشمی کے ناول ''تلاشِ بہاراں''، ''دشتِ سُوس'' عبداللہ حسین کے ناول ''اداس نسلیں''، ''باگھ''، بانو قدسیہ کے ناول ''راجہ گدھ'' کے موضوعات اور کردار نگاری کی خوبیوں اور ان ناولوں میں عصریت کی تلاش کی ہے۔ پاکستان کے سیاسی و سماجی پس منظر میں ۱۹۶۰ء کی دہائی کا زمانہ کئی حوالوں سے اہم ہے۔ اسی دور میں جدیدیت کی تحریک سے وجودیت کے حامل افکار کو فروغ ہوا اور اسلوب کی سطح پر علامت نگاری کا چلن عام ہوا نیز موضوعاتی سطح پر پاکستانی مارشل لائی استبداد کے خلاف مزاحمت کو فروغ ملا۔ دیگر اصناف کی مانند اردو ناول میں علامتی انداز اپنایا گیا۔ مصنف نے وجودیت کے فروغ کے حوالے انیس ناگی کے ناولوں ''دیوار کے پیچھے'' اور ''محاصرہ''، علامتی استعمال کے حوالے انور سجاد کے ناولوں ''خوشیوں کا باغ'' اور فہیم اعظمی کے ناول ''جنم کنڈلی'' میں تلاش کیے ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر ناول نگاروں کے ناولوں کے موضوعاتی، اسلوبیاتی اور تکنیکی حوالوں کے ساتھ ساتھ عصریت کے پس منظر میں تنقیدی مطالعات اس باب کا حصہ ہیں، جس کا مطالعہ ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔

باب پنجم بعنوان ''ناول اور عصریت: چند نئے مباحث'' باقی ابواب کی نسبت ضخیم نہیں مگر کافی اہم نئے سوالات کو پیش کرتا ہے جن میں آج کے عہد کی عصریت کے ساتھ اردو ناول کا کیا ربط و تعلق بنتا

ہے، اگر بنتا ہے تو کس طرح اور اس کے علاوہ اردو میں اعلیٰ تخلیقی ناولوں کی عدم دستیابی کے اسباب گنوائے گئے ہیں۔ اُردو ناول کی پہلی بد قسمتی یہ ہے کہ اس کا جنم داستان کی کوکھ سے نہیں ہوا۔ داستان تخیل کی بلند پروازی کا بہترین نمونہ تھی۔ گو کہ اس کا تعلق حقیقت سے کم تھا لیکن فنکار تخیل، حسن اور ممکنہ صداقت کے تمام پہلو کھوج لیتا تھا۔ اس کے بر عکس اُردو ناول کا آغاز ڈپٹی نذیر احمد کی کھری عقلیت، مثالیت پسندی اور خالص اصلاح پسندانہ نقطہ نظر سے ہوا، جس میں تخیل کی گنجائش ہی نہ تھی۔ سو ناول نگار کا مقصد محض سماج سدھار رہ گیا۔ دوسری قباحت بھی نذیر احمد ہی کی اختراع ہے یعنی ناول میں مثالی کرداروں کی پیشکش جو اچھائی یا برائی کے نمائندہ مثالی کردار ہوں۔ اُردو ناول آجتک ان مثالی کرداروں سے نجات حاصل نہیں کر سکا۔ جیسا کہ قرۃ العین حیدر کے ناول "آگ کا دریا" میں تمام کردار اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں، ایک جیسے شوق رکھتے ہیں، لکھنو کے ان میں ایک تو یہ سبب ہے کہ ناول نگار پر اصلاح کا جذبہ حاوی رہتا ہے، جس کی بنا پر وہ وقوعے کو لپیٹ کر طاق پر رکھ دیتا ہے اور اصلاح کا لٹھ اُٹھا لیتا ہے۔ یوں ناول کا تبلیغی انداز اور سستی رومانیت اسے ناول کے فنی درجے سے گرا دیتی ہے۔ دراصل ناول کو زندگی کے مطالبات اور اس کے تقاضوں سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہونا چاہیے اور ناول نگار کو اس ماحول کو موضوع بنانا چاہیے، جس سے وہ پوری طرح آگاہی رکھتا ہو۔ اچھے اور عالمی سطح پر کامیاب ناول کی تخلیق میں ایک اور مزاحمت برصغیر کے مزاج کے راستے سے بھی آئی۔ اردو کا مزاج ابتدا سے ہی تغزل کی جانب مائل رہا اسی لیے اس میں ایمائیت، اشاریت، اختصار و ایجاز کو اہمیت حاصل رہی۔ اسی اختصار و ایجاز کی صفت کے باعث افسانے کی صنف ناول سے زیادہ مقبولیت حاصل کر گئی۔ حالانکہ افسانے کا آغاز ناول کے آغاز سے کم و بیش ۳۳ برس بعد ہوا۔ ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارے سماج میں ناول کے آغاز سے اب تک سیاسی آزادی کے مواقع بہت کم آئے ہیں۔ نو آبادیاتی سامراج کی منشا کے بر خلاف کچھ تحریر کیا ہی نہیں جا سکتا تھا اور جو لکھا گیا، انھی کے مقصد کو بڑھاوا دے رہا تھا بعد ازاں پاکستانی سماج میں بھی نو آبادیاتی تسلسل باقی رہا۔ جاگیر دارانہ تمدن میں تنقید کی گنجائش نہیں ہوا کرتی اور ہمارا سماج مجموعی فضا میں جاگیر دارانہ مزاج کا حامل رہا ہے جبکہ ادب تنقید حیات ہوتا ہے اس لیے یہاں مخالفانہ نقطۂ نظر کو پذیرائی نہیں مل سکی۔ ایسی ہر آواز کو دبانے کی کوشش کی جاتی رہی جو ریاستی جبر میں شگاف ڈالنے کی آرزو مند رہی ہو۔ اس کے علاوہ لسانی، مذہبی اور سماجی مسائل پر بھی مصنف نے عمدگی سے روشنی ڈالتے ہوئے اس امر کی جانب بھی اشارہ کیا ہے کہ اردو ناول کے پُر اثر نہ ہونے اور آفاقیت کے درجے تک نہ پہنچ سکنے کی ایک وجہ روسی ناول نگاروں کی ادھوری تقلید بھی ہے۔ اس

ضمن میں مصنف نے روسی ناولوں کی مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ مصنف کے نزدیک جغرافیائی حوالے سے فطری سستی و تساہل پسندی اور معاشی فارغ البالی کا میسر نہ آسکنا بھی اچھے تخلیقی ناولوں کی عدم دستیابی کی وجوہات ہیں مگر اکیسویں صدی کے ابتدائی عشرے میں مرزا اطہر بیگ کے ناول "غلام باغ" کی اشاعت اطمینان کا باعث ہے۔

اس باب کے آخری حصے میں ڈاکٹر کامران کاظمی نے اردو ناول پر تنقید کی عمومی صورتحال کا جائزہ لیتے ہوئے اس سلسلے میں دو پہلوؤں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے ایک ناول کے نظری مباحث اور انفرادی مطالعہ یعنی فن ناول نگاری اور ناول کا موضوعاتی مطالعہ ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ فن ناول نگاری کے حوالے سے بدقسمتی سے اردو میں کچھ خاص، اہم اور مستند کتب دستیاب نہیں ہیں۔ جب تک ناول کی تنقید پر قابل ذکر کام سامنے نہیں آئے گا تب تک اچھے اور پُر اثر ناول کی تخلیق کی خواہش حقیقت کا روپ نہیں دھار سکے گی۔ مصنف کے مطابق فکشن کی تنقید کی کم یابی اور معیار کی غیر تسلی بخش حالت کا ذمہ دار براہ راست نقاد ہے۔ کیونکہ نقاد کی سہل انگاری نے اردو ناول کی تنقید کے نہ تو پیمانے مقرر کیے اور نہ ہی تنقید کی کوئی روایت پیدا کی۔ لہٰذا اچھے ناولوں کے تخلیق نہ ہونے کے اسباب میں ناول کی تنقید کا بھی ہاتھ ہے۔ ناول کی تخلیق کی روایت میں مقامی شعریات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے نہ تو ناول نگاری کے فن کے حوالے سے کوئی اہم قابل ذکر تصنیف سامنے آئی اور نہ ہی ناول کی تخلیق کے حوالے سے کوئی جامع تصنیف منظر عام پر آسکی۔ ناول نگاری پر تنقید کا مکمل انحصار جامعات کی سطح پر لکھے جانے والے مقالات تک محدود ہے۔ چونکہ اکثر طلبا میں ادبی شعور اور تنقیدی بصیرت کا اعلیٰ معیار نہیں ہوتا اور پھر ان کا بنیادی مقصد ڈگری کا حصول ہوتا ہے لہٰذا جامعات کی سطح پر کیا گیا کام اعلیٰ ادبی معیار کا حامل نہیں ہوتا۔ مصنف چونکہ خود بھی درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ ہیں لہٰذا اس ضمن میں اُنھوں نے جامعات میں اچھی اور معیاری تحقیق کے حوالے سے مفید تجاویز بھی پیش کی ہیں، جن کے عملی اطلاق کے بعد بِلاشُبہ جامعات میں اردو ناول پر تنقیدی اور اعلیٰ معیاری تحقیقی مقالات کو ممکن بنایا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر کامران عباس کاظمی کی اردو ناول اور عصریت کے موضوع پر کتاب بے شک وشُبہ اپنی طرز کی بنیادی اور اہم تصنیف ہے۔

حواشی:

۱۔ مظفر حسن ملک،ڈاکٹر،ثقافتی بشریات، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان،پاکستان،طبع اول، ۲۰۰۴ء،ص۱۹۲

۲۔ محمد علی صدیقی،ڈاکٹر،ادب اور ثقافت،مشمولہ؛ کلچر(منتخب تنقیدی مضامین)، مرتبہ:اشتیاق احمد، لاہور:بیت الحکمت،۲۰۰۷ء،ص۱۸۱

۳۔ کامران عباس کاظمی،ڈاکٹر،اردو ناول اور عصریت،لاہور:الوقار پبلی کیشنز،۲۰۲۳ء، ص۴۶

۴۔ عابد حسن،منٹو،''نقطہ نظر''،لاہور:ملٹی میڈیاافیئرز،طبع دوم،۲۰۰۳ء،ص۱۱۱

۵۔ جمال نقوی،ترقی پسنداور اردو نثرکے پچاس سال،اسلام آباد:مقتدرہ قومی زبان،طبع اول،۲۰۱۲ء،ص۱۳

۶۔ سی اے قادر،پروفیسر،اکرام رانا(مولفین)، کشاف اصطلاحات فلسفہ،لاہور:بزم اقبال،طبع اول،۱۹۹۴ء،ص۳۶۵

۷۔ عزیز احمد،ترقی پسند تحریک، ملتان:کاروان ادب،۱۹۹۳ء،ص۵۶

۸۔ محمد عارف،ڈاکٹر،اردو ناول اور آزادی کے تصورات،لاہور:پاکستان رائٹرز کو آپریٹو سوسائٹی،طبع اول،۲۰۰۶ء،ص۱۳۸۸

۹۔ یوسف سرمست،ڈاکٹر،اردو ناول بیسویں صدی میں،کراچی:اردواکیڈمی سندھ،۱۹۷۳ء، ص۲۲۱

۱۰۔ رؤف پاریکھ،ڈاکٹر،اردو نثر میں مزاح نگاری کا سیاسی اور سماجی پس منظر،کراچی:انجمن ترقی اردو پاکستان،طبع اول،۹۷/۱۹۹۶ء،ص۳۷۰

۱۱۔ خالد اشرف،ڈاکٹر،برصغیر میں اردو ناول،لاہور:ابلاغ،۱۹۹۴ء،ص۲۰۷

۱۲۔ ممتاز احمد خان،ڈاکٹر،اردو ناول کے ہمہ گیر سروکار،کراچی:ماجراسرائے پبلی کیشنز،اشاعت اول،۲۰۰۸ء،ص۱۵۴

۱۳۔ رشید امجد،ڈاکٹر،شاعری کی سیاسی و فکری روایت،لاہور:دستاویز مطبوعات،طبع اول، ۱۹۹۳ء،ص۱۱۵